سپرد فیسر ڈاکٹر حیدر سندھی

پانچویں قسط

سندھی ادب کا مختصر جائزہ

شعری اصناف، اپنے تاریخی تناظر میں

یہ طبقہ، آسمان سے غیبی مدد کی امید رکھنے، نصیب اور مقدر پر یقین کرنے اور ہر کام میں اللہ کی رضا اور مصلحت تلاش کرنے کی ترغیب دیتا۔ یہی طبقہ ایرانی سرزمین پر پروان چڑھنے والی شاعری میں سنبل و سوسن جیسے ملائم جسم کے مالک محبوب کے ناز و انداز، حسن و خوبصورتی، اس کے ہونٹوں، پیشانی، گیسو، چال، گال دانتوں، آنکھوں، کٹاری نینوں، چشم آہو، پتلی کمر، نازک کلائی اور سڈول پن کی تصوراتی اور تخیلاتی باتیں سناکر عوام کو فراریت کی راہیں دکھانے میں مشغول رہا۔ ایسے طبقے نے ہی غزل، سی حرفی، مثنوی اور رباعی کو سندھی زبان سے روشناس کرایا اور بحر و وزن بھی وہی متعارف کرائے۔ لیلیٰ مجنون، گل بکاولی، قصہ چہار درویش اور اس طرح کی مافوق فطرت داستانیں، ان دنوں سندھی میں داخل ہوئیں۔

جبکہ پہلے طبقے نے مہندی کی خوشبو، بارش کے وقت مٹی سے اٹھنے والی بھینی بھینی مہک کے علاوہ مور، کوے اور کبوتر جیسے عام دیکھے بھالے مقامی پرندوں کی علامات استعمال کیں۔ سئ اور سوہنی، جیسی عورتوں کے باہمت اور باعزم کرداروں کے ذریعے دوسرے فرقے کے شعراء کے خیال کی نہ صرف نفی کی بلکہ اپنی روایتی اور انجیر

کے پھل کی طرح براہ راست درخت کے تنے سے جنم لینے والی ان اصناف میں وسعت پیدا کی جو دل کی دھڑکن گن کر ماتراوں کے پیمانے کے ذریعے تخلیق کی جاتیں۔

ایک طرف شعراء اپنی تخلیقات میں تخیلاتی تصوراتی اور حقیقی مسائل اور موضوعات پیش کر کے ادب کی وسعت میں اضافہ کر رہے تھے تو دوسری طرف اہل علم و قلم دینی علوم کو سندھی زبان کے ذریعے ہر سندھی خواندہ گھر تک پہنچانے کے لیے کوشاں تھے۔ ایسے علماء میں مخدوم ابوالحسن سندھی (ولادت ۱۶۶۱ء) بھی شامل تھے، جنھوں نے سن ۱۷۰۰ء میں سندھی میں مقدمۃ الصلوٰۃ نامی کتاب تصنیف کی۔

مخدوم ضیاء الدین (ولادت ۱۶۷۹ء، وفات ۱۷۵۷ء) بھی اسی عہد کے تھے جن کا تعلق سہروردی مسلک سے تھا۔ ٹھٹھ سندھ کے ممتاز و مشہور عالم مخدوم عنایت آپ کے استاد اور عالم اسلام کی جانی پہچانی عظیم علمی شخصیت مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی آپ کے شاگرد تھے۔ مخدوم ضیاء نے تصانیف کے روپ میں کئی موضوعات سندھی ادب کو دیے ہیں۔

مخدوم محمد ہاشم کا شمار بہت بڑے دینی علماء میں ہوتا ہے۔ آپ کو تبحر عالم کا خطاب دیا گیا تھا۔ انھوں نے اسلام کو بدعت اور دیگر خرافات اور خرابیوں سے پاک کرنے پر زیادہ توجہ دی۔ اس ضمن میں آپ نے سندھ کے حاکم غلام شاہ کلھوڑا، ہمسایہ ممالک کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ کو بھی مدد کے لیے خطوط لکھے اور اسلام کو بدعتوں سے پاک کرنے میں ان کی تائید حاصل کی، جن علاقوں میں پانی کی قلت تھی وہاں وضو اور غسل کے لیے کوزے اور گھڑے خاص مقدار کے بنوائے۔ ایسے ہاشمی کوزے اور گھڑے آج بھی سندھ میں بنتے ہیں۔

آپ نے ہندوؤں کے لیے پابندی کی کہ وہ دکان یا کھلے مقامات اور چوپال میں

دھوتی باندھ کر نہ بیٹھا کریں۔ اس پابندی کی وجہ سے کھلے پائنچوں والے پاجامے پہننے کا رواج عام ہوا۔ ایسے پاجاموں کو سندھی میں "چرنو" کہا جاتا ہے، جسے اب بھی گرمی میں اور شب خوابی کے لباس میں پہنا جاتا ہے۔

ان کوششوں کی وجہ سے سندھی ثقافت کی تعمیر نو ہوئی اور بہت ساری بدعتوں کی بیخ کنی کی گئی اور اجتماعی زندگی اسلامی عقائد میں ڈھل گئی۔ آپ سن ۱۷۲۲ء میں حج کی سعادت حاصل کرنے مدینہ منورہ پہنچے تو آپ سے قبل آپ کی علمی فضیلت کا شہرہ وہاں پہنچ چکا تھا، جس کی وجہ سے آپ کی بڑی تعظیم و تکریم ہوئی۔ دو سال بعد آپ سیدھے سورت کی بندرگاہ پر آکر اترے اور وہاں کے مشہور ممتاز نقشبندی بزرگ سید محمد سعیداللہ کے مرید بنے۔

آپ نے سندھی، عربی اور فارسی میں تحریر، تقریر، تدریس اور تبلیغ کو تیز کیا اور لاتعداد کتابیں تصنیف کیں۔ ان تصانیف میں ابوالحسن جی سندھی استعمال کی گئی۔ یہ تصانیف سندھ کے علاوہ بیرون سندھ میں بھی بڑی مقبول ہوئیں۔ ایسی کتابوں میں فرائض الاسلام، ذبح شکار، زادالفقیر اور قوت العاشقین سمیت تین سو کے قریب مسودے مختلف مطالعہ گاہوں میں موجود ہیں۔ ان مسودات میں فقہ کے مختلف مسائل کی توضیح اور تشریح بھی موجود ہے، جنھیں مصر کی الازہر یونیورسٹی نے نصابی کتب میں شامل کیا اور محققین آج بھی ان سے حوالے پیش کرتے ہیں۔ آپ نے سن ۱۷۶۰ء میں رحلت فرمائی۔ آپ کے طلبہ کی تعداد کئی ہزار تک تھی، جنھوں نے اس آورش کو آگے چلایا۔

ایسے باتعظیم طلباء میں مولوی عبدالخالق کا نام بھی موجود ہے، جس نے اپنے استاد کی شہرت کو تصنیف و تالیف کے ذریعے مزید بڑھایا اور ان کی یہ علمی کاوشیں سندھ کے

مختلف مدارس کے نصاب کا حصہ ہیں۔

مولوی محمد حسین بھی اسی زمانے کے تھے جنھوں نے سندھی میں بہت ساری علمی اور دینی کتابیں لکھیں۔ علاوہ ازیں آپ نے قصص الانبیاء کا فارسی سے سندھی میں بڑے دلچسپ پیرائے میں ترجمہ بھی کیا۔

عہد کے اعتبار سے مخدوم محمد ابراہیم بھی اسی دور کے تھے، جنھوں نے دینی کام کو کافی وسعت دے کر سندھی زبان کو قابل فخر بنایا۔ آپ کی ہر تحریر، ابوالحسن جی سندھی میں لکھی گئی ہے۔

منگریہ قوم کے مخدوم عبدالرحیم گرھوڑی ولد سعداللہ بھی بہت بڑے عالم اور اہل اللہ گزرے ہیں اور آپ کا زمانہ بھی یہی تھا۔ آپ کا جنم ۱۷۳۹ء اور وفات ۱۷۷۸ء میں ہوئی۔ آپ پوری زندگی مت خانوں اور ہندومت کے خلاف سرگرم رہے۔ آپ کی شہادت بھی ایسے ہی موقع پر ہوئی، جب ایک مندر کو ڈھایا جارہا تھا۔ آپ لواری شریف کے صاحب علمیت و فضیلت اور ولی اللہ مخدوم محمد زمان کے مرید تھے اور اپنی علمی حیثیت پر ناز کرتے تھے۔ آپ کی تصانیف میں فتح الفضل، شرح ابیات سندھی، مکتوبات اور رسالہ گل نما کو شاہکار گردانا جاتا ہے۔ آپ سندھی کے علاوہ فارسی اور عربی میں، یکساں روانی کے ساتھ لکھتے تھے۔

اگرچہ آپ کے متعلق یہ پختہ روایت مشہور ہے کہ آپ نے ۷۲ منظوم پیشن گوئیاں بھی لکھی ہیں جن کا تعلق سندھی سماج، سندھ کے مستقبل اور قیامت کی نشانیوں سے ہے، لیکن اس روایت کی تحقیق ابھی ہونی ہے۔ تاہم آپ سے منسوب مذکورہ پیشن گوئیاں موجود ہیں۔

ضلع خیرپور (میرز) سندھ کے گاؤں کھہڑو (Khuhra) کے مخدوم عبدالرحمٰن بھی زیربحث دور کے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تحریر اور تقریر میں بڑی تاثیر رکھی تھی جسے آپ نے تبلیغ دین کے لیے بڑے مثبت و مفید انداز میں استعمال بھی کیا۔ آپ صاحب کرامت ہونے کے ساتھ صاحب کتاب بھی تھے۔

چونکہ کلہوڑا خود بھی آغاز میں درویشی اور پارسائی کو زینہ بناکر اقتدار تک پہنچے تھے، اس لیے مخدوم عبدالرحمٰن کی پارسائی اور نیک نامی سے کافی خائف تھے۔ چنانچہ حاکم وقت میاں نور محمد کلہوڑو نے ۱۷۵۳ء میں فوجی حملہ کرکے مخدوم صاحب، ان کے پیروکاروں، عقیدتمندوں اور احترام کرنے والے دو سو سے زائد لوگوں کو عین نماز کے وقت مسجد میں شہید کرادیا۔

اسلامی اصولوں پر کاربند رہنے کے داعی کلہوڑا حکمران کے اس فعل کو، ٹھری میرواہ سندھ کے مخدوم عبداللہ نے منظوم کیا تھا۔ نمونہ کلام کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

اے رحیم و کریم، عاجزوں پر نظر کر،
اے رحم کرنے والے، مشکل میں درماندوں کی فریاد سن، مدد کر
اے عالی مرتبت، تیرے دروازے پر کئی حاجت مند آئے ہیں
سب کی حاجت روائی کر۔ التجا قبول فرما۔ اے بے یاروں کے یار۔ مدد فرما...... الخ

ان زیر تذکرہ دنوں میں علماء و فضلاء کے علاوہ ملاؤں کی بھی ہر علاقے میں بہتات تھی۔ انھیں اگرچہ عوام میں کوئی مقبولیت نہیں تھی، لیکن سستی شہرت، حاکموں تک رسائی کے حصول، بااثر لوگوں کی قربت اور خواہشات کی تکمیل کی خاطر بکاؤ مال بن کر ہر جگہ پہنچ جاتے اور چند مراعات یا سہولتوں کے عوض دین کا سودا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے

تھے۔ اس بات کی تصدیق، رانی پور (سندھ) کے ایک ممتاز عالم محمد شریف کی تصنیف "سندھی" سے ہوتی ہے جو کہ سن ۱۷۴۹ء کی ہے آپ نے لکھا ہے کہ "اللہ کی اکثر مخلوق کو ملاؤں نے گمراہ کر رکھا ہے۔ لفظ ملاں کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو بظاہر (تسبیح کرتے یا انگلیوں پر اسم اللہ) پڑھتے رہتے ہیں، لیکن ہوتے بصیرت سے عاری ہیں۔ ان میں فراست ایمان تو ہے ہی نہیں......"

ایسے ہی حالات تھے جب سن ۱۶۸۹ء میں ضلع حیدر آباد (سندھ) کی تحصیل ہالا کے ایک گاؤں "ہالا حویلی" کے ایک ولی اللہ، درویش صفت اور عبادت گزار ہونے کی وجہ سے وسیع حلقے میں بااثر حیثیت رکھنے والی شخصیت شاہ حبیب سید کے گھر میں ایک بچے کا جنم ہوا، جسے بڑا ہو کر دنیا میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کے نام سے شہرت ملی۔ آپ کو "بھٹائی" اس لیے کہا جاتا ہے کہ آپ نے، اپنے گاؤں سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک ٹیلے پر مستقل مسکن بنایا۔ سندھی زبان میں ٹیلے کے لیے "بھٹ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی نسبت سے آپ کو "بھٹائی" یعنی "ٹیلے پر رہنے والا" کہا گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں اب "بھٹ شاہ" کا شہر موجود ہے۔

شاہ عبداللطیف نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے والد سید حبیب شاہ کے گرد مریدین اور معتقدین کا بہت وسیع حلقہ دیکھا۔ وہ شاعر بھی اعلیٰ پایہ کے تھے اور آپ کے دادا شاہ کریم (بلڑی والے) بھی بہت بڑے شاعر تھے جن کا زمانہ ارغون اور ترخان دور تھا۔ آپ کی پرہیزگاری، عبادت گزاری، پارسائی، پاکبازی، حق پرستی اور راست گوئی کی لوگ قسمیں کھایا کرتے تھے۔ آپ کی شاعری تو اتنی مقبول ہے کہ آج بھی محفلوں یا روزمرہ کی گفتگو میں محاورتاً اور اصطلاحاً پیش کی جاتی ہے۔ تصوف میں آپ "ہمہ اوست" کے مسلک پر کاربند

تھے۔

شاہ لطیف جب ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہوئے تو آپ کو، نزدیک کے ایک بڑے دینی مدرسے میں داخل کرایا گیا، جہاں اس علاقے کے ایک ممتاز عالم دین درس و تدریس دیتے تھے۔ استاد نے جب آپ کو "الف" کے بعد "ب" پڑھنے کو کہا تو آپ نے یہ کہہ کر مزید پڑھنے سے انکار کیا کہ "نہ" "الف" سے پہلے کچھ تھا اور نہ بعد میں کچھ ہے۔

چھوٹی عمر میں اس طرح معرفت کی باتیں صرف اہل سلوک ہی کرسکتے ہیں اور اہل معرفت ہی ایسے رموز سے باخبر ہوتے ہیں۔ چنانچہ شاہ لطیف کو قائل کرنے کی بڑی کوشش کی گئی، لیکن آپ نے کسی مدرسے میں بیٹھ کر کسی عالم سے پڑھنے پر سیر و سیاحت کے ذریعے فطرت کا مطالعہ کرنے اور تاریخ میں موجود موضوع بحث نکات کا خود مشاہدہ کرنے اور معاملات کی تصدیق کرنے کو ترجیح دی۔

سوانح نگاروں کو آپ کے ہمراہ سفر و حضر کے دوران کلام پاک، مثنوی مولانا جلال الدین رومی اور اپنے پردادا شاہ "عبدالکریم جو کلام" ہر وقت ساتھ رکھنے کا ثبوت ملا ہے، جس کی بنا پر انھوں نے بلاتردید کہا ہے کہ "شاہ لطیف پڑھے لکھے تھے ورنہ یہ کتابیں اور وہ بھی بہت اہم موضوعات پر مشتمل، اپنے ہمراہ رکھنا چہ معنی دارد"۔

شاہ لطیف پر تحقیق کرنے والے تمام محقق بھی اس بات کے حق میں ہیں کہ "شاہ صاحب کا کلام سلاست، فصاحت، بلاغت، منظر نگاری، علامت نگاری، جدت اور جوش (جو کہ یہ خصوصیات ایک انتہائی اعلیٰ پایہ کی شاعری کے لیے ضروری ہوتی ہیں) شاہ صاحب کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔" مذکورہ خصوصیات کی کلام میں موجودگی بذات خود

شاہ صاحب کے تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت ہیں اور تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ہی آپ کا پیغام لاثانی اور آفاقی بنا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ نے اپنے کلام کو عام انسانی ذہن کی سطح تک لاکر اسے آسان اور عام فہم بنانے کے خاطر جو بے مثال تشبیہات دی ہیں، استعارے او محاورے پیش کیے ہیں، روزمرہ زندگی کے تجربات اور مشاہدات جس علمیت، ذہانت، مہارت اور قابلیت کے ساتھ شاعری سے پیوستہ کیے ہیں وہ کسی "امی" شاعر کا کام نہیں ہو سکتا۔

مذکورہ خوبیوں اور خصوصیات کی آپ کے کلام میں موجودگی ہی آپ کی شاعری کو اپنے عہد، ماضی یا مستقبل کے شعراء کے کلام میں حد فاصل بناتی ہیں۔ آپ کی اعلیٰ پایہ کی شاعری کے پیش نظر یہ گمان ہوتا ہے کہ آپ اگرچہ بظاہر کسی عالم دین سے رسمی تعلیم حاصل کرتے نظر نہیں آتے، تاہم آپ نے اس عہد کے کچھ ممتاز علماء کی صحبت میں رہ کر علوم حاصل کیے ہوں گے۔

آپ کے بارے میں نامور اہل علم سے حصول علم کی تصدیق تاریخ کے ان حوالوں سے بھی ہوتی ہے جن مین بتایا گیا ہے کہ "شاہ عنایت (جھوک وارو) شہید، ٹھٹھہ کے مخدوم محمد معین، کھہڑن وارو مخدوم عبدالرحمٰن اور شاہ لطیف یہ چاروں آپس میں بہت گہرے دوست تھے اور کئی کئی دن ایک دوسرے کے پاس آکر ٹھہرتے تھے۔"

یہ ان علماء کی صحبت کا ہی نتیجہ تھا کہ آپ کے کلام میں جابجا بڑی قابلیت سے عربی مقولے، کہاوتیں، احادیث، کلام الٰہی کی آیات کے حصے، اسلامی علوم سے اشارے، ظاہری مشاہدات سے تشبیہات، تاریخیں اور تماثیل کے اقتباسات کو بڑی مہارت سے اور

برصغیر میں مروجہ بحر و وزن کے مطابق ڈھالا گیا ہے۔ "شاہ جو رسالو" آپ کے مجموعہ کلام کو کہا جاتا ہے۔ شاہ جو رسالو میں ایران کے ممتاز شاعر اور برگزیدہ علمی شخصیت مولانا جلال الدین رومی جوکہ سن ۱۲۷۳ء کے تھے، ان کی مثنوی کے اشعار کا سندھی ترجمہ جس قابلیت سے سندھی اشعار میں شامل کیا گیا ہے اور ایران میں مروج تصوف کے "ہمہ اوست" مسلک کو جس ماہرانہ انداز سے سندھی میں سمویا گیا ہے، یہ سب اس بات کے گواہ ہیں کہ شاہ لطیف اعلیٰ علمی مسند پر براجمان تھے۔

آپ کی شاعری، وقت اور مقام کی قیود سے آزاد ہونے کے باعث ہر اس مظلوم کے دل کی صدا اور پکار ہے، جو بے بس، بے کس، درماندہ اور پسماندہ ہے اور جس کے ساتھ یہ مظالم مذہب، انسانیت اور اعلیٰ اقدار کے نام پر روا رکھے جاتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے شاہ صاحب کو نہ مغلوں کے درباروں اور محلوں میں پروان چڑھنے والی سازشوں سے کوئی سروکار تھا نہ کلہوڑا حاکموں کی دکھاوے کی پارسائی اور عملی طور پر ظالمانہ کارروائیوں سے کوئی غرض تھی۔ آپ کو اس بات سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا کہ کس ملاں نے بااثر لوگوں، صاحب حیثیت شخص یا حاکم کی خوشنودی کی خاطر نیکوکاروں کی پگڑی اچھالنے کے لیے کتنی رقم لے کر کوئی فتویٰ صادر کیا ہے۔ اگر آپ کو فکر تھی تو اس بات کی کہ جو بھی حاکم وقت سندھ میں رہا، مذہبی پیشوا کے طور پر شہرت کمائی یا کوئی جاگیردار، خانوادہ، رئیس زادہ یا صاحبزادہ، پیر زادہ اور صوفی کے القاب سے پہچانا جاتا ہے۔ ہر ایک نے معاشرے کی اعلیٰ اقدار ختم کرنے، طبقات کو فروغ دینے، اتفاق مٹا کر نفاق کو عام کرنے، محبت کو نفرت میں تبدیل کرنے اور علم کی روشنی پھیلانے کی بجائے جہالت کا اندھیرا عام کرنے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ انہی حالات نے آپ کو یہ کہنے پر مجبور

کیا کہ :

لوگو، آؤ جلاہوں کی طرف چلیں،

جہاں وہ سارا وقت جوڑنے میں گزارتے ہیں، توڑنا جنھوں نے سیکھا ہی نہیں۔

آپ علماء کی طرف سے بے علمی کی سرگرمیاں شروع کرنے پر بھی خفا تھے۔ کیونکہ علماء کا کام تو سماج میں عزت و احترام، ادب و آداب، پیار و محبت کی فضا کو فروغ دینا ہے نہ کہ لوگوں کو بے راہ روی، بے ادبی، منافرت اور مفاد پرستی کی طرف رغبت دلانا۔ علماء تو عوام کو صراط مستقیم دکھانے میں ظالم کے سامنے حق سچ کہنے میں پہل کرنے کی جرأت کرتے ہیں، لیکن یہاں نوبت یہ تھی کہ علماء مصلحت کوشی کا شکار تھے۔ ان کی نظریں ہر وقت صاحب اثر و رسوخ کے چہرے پر مرکوز رہیں کہ کس بات سے اسے خوشی اور کس سے رنج پہنچتا ہے۔ ان کے تیور دیکھ کر خطبات دیتے، واعظ کرتے، تقریریں کرتے اور کچھ تحریر کرتے تھے۔ ایسے مفاد پرستوں کو شاہ صاحب نے باآواز بلند کہا کہ خدمت کرنی ہے تو سوئی کی طرح بے لوث خدمت کرو۔

شعر کی زبان میں آپ نے فرمایا کہ :

"پاچھاھی نہ پاڑیاں، سرتیوں سوئی سان،
ڈھکے اگھاڑن کھے، کین ڈھکیائیں پان،
ھمر جاپی جان، امرجے اوصاف کھے"

ترجمہ : سوئی کو، قربانی اور بے لوث خدمت گزاری ترک کرنے کے عوض اگر بادشاہی دی جائے تو وہ اسے ہرگز قبول نہیں کرے گی۔ وہ تو ہمیشہ سے دوسری کی ستر پوشی کرنے میں آسودگی محسوس کرتی ہے۔ اسے کبھی، خود کو ڈھانپنے کا خیال تک نہیں آتا۔

"سوئی" کی خوبیاں اور اوصاف جاننا ہوں تو دوسری زندگی لے کر آنا ہوگا، کیونکہ وہ اتنی ہیں کہ انھیں جاننے کے لیے تمہاری یہ زندگی ناکافی ہوگی۔"

شاہ صاحب کی قوت فکر بھی اس قدر پختہ ہے کہ جتنی بار آپ کے کلام پر غور کیا جائے اس کے تخیل اور تصور میں اتنی بار نیاپن نظر آئے گا۔ آپ کے سامنے، ایک انسان دوسرے کی مدد اور سہارا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ذات پات، کمتری اور بدتری، اعلیٰ اور ادنیٰ کے درجات صرف خدمت انسانی سے وابستہ کیے ہیں۔ آپ کے خیال میں جتنی کوئی شخص، انسانذات کی خدمت کرے گا، اتنا ہی اس کا مرتبہ بڑھے گا۔ رتبے کی اونچ نیچ کسی ذات کی تعین بلکہ انسانی خدمت پر منحصر ہوتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ :

"پائے کان کمان میں میاں مارمہ موں، موں میں آھیں توں، متاں تن ہنجوئی توکھے لگے۔"

ترجمہ : کما میں تیر کس کر تم جو مجھے مارنے لگے ہو، ذرا غور تو کرو، تم ہی تو میرے اندر موجود ہو، کہیں یہ تیرا تیر تجھے ہی نہ گھائل کردے۔

آپ کی شاعری، ہر ذہنی سطح کے فہم و فراست کو چھولیتی ہے۔ اس شاعری میں جن جذبات، امنگوں اور احساسات کو سمویا گیا ہے وہ ہر ذی روح میں یکساں ہیں۔

شاہ صاحب کے مجموعۂ کلام کو شاہ جو رسالو کہا جاتا ہے۔ سندھی میں "رسالو" کا لفظ ایسے کلام کے لیے مخصوص ہے جو سارے کا سارا روحانی اور ربانی رموز سے بھرا ہوا ہو اور تمام کا تمام گائے جانے کے لیے ہو۔ شاہ صاحب کا کلام بھی روحانی رموز اور ربانی اسرار کی باتوں سے لبریز ہے۔ یہ کلام شروع سے لے کر آخر تک موسیقی سے بھی ہم آہنگ ہے، اس لیے اس کا ہر مصرع، ہر بند اور شعر گایا جاتا ہے۔ ایک مصرع بھی نہیں ہے جسے گایا نہ

جاسکے۔ کارلائل نے ایسے ہی کلام کو صفِ اول میں سرِ فہرست رکھنے کا فیصلہ دیا تھا۔

شاہ جو رسالو کو مختلف راگوں کے ناموں کے عین مطابق مرتب کیا گیا ہے جو یہ ہیں : سر یمن کلیان، رسالو کا اولین سر ہے جس میں صوفیانہ موضوع سمویا گیا ہے۔ یہ موضوع تصوف میں اس قدیم تصور کا عکاس ہے، جس کے مطابق ابلیس کو سب سے بڑا عاشق گرداگردانا گیا ہے۔ ابلیس کی انسان کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ جو سر ایک بار بارگاہ ایزدی میں جھکا ہے وہ کسی دوسری ہستی کے آگے نہیں جھک سکتا۔ شاہ صاحب نے بھی کہا ہے کہ عاشق عزازیل، بیامڑئی سدھڑیا۔

عاشق تو عزازیل تھا، باقی جو بھی عاشق ہونے کا دعویٰ کرتے ہین یہ محض ان کا ارمان یا حسرت ہے۔

دوسرے سردں میں سر سرے راگ، سر رامکلی، سر کاپائتی، سر پربھاتی، سر کاموو، سر کیدارہ، سر بروو، سر کارایل، سر گھاتو، سر ساموندڑی، سر سورٹھ، سر رانو، سر دہر، سر کھنبھات، سر سارنگ، سررپ اور اس طرح پورا رسالہ تیس سردں پر مشتمل ہے۔ تمام سر ابیات کا مجموعہ ہیں، جبکہ آپ نے، ابواب کی جائے لفظ "داستان" استعمال کیا ہے۔ ہر داستان کے آخر میں مذکورہ داستان میں شامل موضوع پر کئی مصرعوں پر مشتمل ایک شعری صنف دی گئی ہے جسے "وائی" کہا گیا ہے۔ سندھی زبان میں وائی کا مطلب کلام ہے۔ اس کی فنی ساخت ہوبہو "کافی" سے مماثل ہے۔

آپ نے اپنے ابیات کو آیات ربانی کی مانند کہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ

جے تو بیت بھائیں، سے آیتوں آھن۔

نیو من لائین پریاں سندے پار ڈے۔

ترجمہ: جسے تم میت سمجھ رہے ہو وہ وہی آیات ہیں جن پر غور کرنے سے دل کا رخ محبوب کی طرف مڑ جاتا ہے۔

شاہ صاحب خود موسیقار بھی تھے، راگداری کے تمام رخوں کو جانتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ برصغیر میں جو راگ، راگنیاں اور سر کتنی "سرتیوں" میں تقسیم ہیں۔ چنانچہ آپ نے ان باتوں کو سامنے رکھ کر ایک ساز ایجاد کیا جسے "طنبورہ" کہا جاتا ہے۔ طنبورے مین پانچ تاریں ہیں جن کو چھیڑنے سے برصغیر میں رائج پانچوں سروں کو گایا جاسکتا ہے۔

شاہ جو رسالو کی موجودہ رسم الخط کے مطابق اولین اشاعت ۱۸۶۶ء میں جرمن اسکالر ڈاکٹر ارنیسٹ ٹرومپ (Ernest - Trumpp) کی کوششوں سے جرمن کے ایک شہر لیپزگ سے ہوئی۔ بعد ازاں ہر دور میں محققین اور مورخین انفرادی طور پور شاہ جو رسالو پر تحقیق، اس کی ترتیب، تالیف اور تدوین کرتے رہے ہیں۔ ایک اور مستشرق ڈاکٹر ایچ ٹی سورلے نے شاہ صاحب کے کلام کا سندھ کے سماجی حالات کے پس منظر میں جائزہ لے کر بھٹ کے شاہ لطیف (Shah Abdul Latif of Bhit) کے نام سے انگریزی میں جو کام کیا اسے دانشوروں نے خوب پسند کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر این میری شمل کی انگریزی کتاب پین اینڈ گریس بھی عالمی شہرت کی حامل ہے۔

بعد میں پروفیسر اکرم انصاری، ڈاکٹر تنویر عباسی، مدرایلسا قاضی، وطن مل، عبدالغفور الستی، علامہ آئی آئی قاضی، ڈاکٹر درشہوار سید، جی ایم سید اور دیگر محققین نے شاہ صاحب کو انگریزی میں روشناس کرانے کے لیے آپ کے کلام کا مختلف رخوں سے جائزہ لیا ہے۔

جبکہ اردو دان طبقے سے شاہ صاحب کو شناسا کرانے کے لیے ڈاکٹر درشہوار سید،

اختر انصاری اکبر آبادی، ممتاز مرزا، آغا خالد سلیم اور آفاق صدیقی نے بھی جو کوششیں کی ہیں وہ لائق تحسین ہیں، تاہم شیخ ایاز نے رسالہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے نام سے جو کتاب تصنیف کی ہے وہ سب میں انفرادیت کی حامل اور انوکھی کوشش ہے۔ نیز حال ہی میں شاہ صاحب کو نثری ترجمہ کے ذریعے بھی متعارف کرایا گیا ہے۔

اہل سندھ سے شناسا کرنے کے سلسلے میں شاہ جو رسالو پر سندھ کے اہل علم اور اہل قلم نے بھی بڑا کام کیا ہے۔ سندھی دانشوروں میں شائد ہی کوئی ایسا اہل علم ہوگا، جس نے شاہ صاحب کے متعلق عرق ریزی نہ کی ہو۔ تاہم ڈاکٹر ایچ ایم گرمشانی، غلام محمد شاہوانی، مرزا قلیچ بیگ، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، محمد عثمان ڈیپلائی اور جی ایم سید وغیرہ کی اعلیٰ قلمی کاوشوں کو حوالے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

شاہ صاحب کو عربی خواندہ طبقے سے متعارف کرانے کے لے آپ کی منتخب شاعری اور سوانح حیات مدینہ منورہ سے شائع ہو چکی ہے جبکہ پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر نبی بخش قاضی اور جرمن سکالر ڈاکٹر این میری شمل کے شاہ پر فارسی مقالے، مضامین، تبصرے اور تذکرے شاہ صاحب کو فارسی اہل علم سے واقف کرانے میں کافی مدد دے چکے ہیں۔ شاہ کو پنجابی میں متعارف کرانے کا کام کرتار سنگھ "ارش" نے امر تسر میں کیا اور ۱۹۹۰ء میں شاہ صاحب پر گرمکھی میں شاہ جو رسالو شائع کیا گیا ہے۔

اسلام آباد کے سرکاری ادارے ادبیات پاکستان نے ۱۹۹۵ء میں پاکستان کے دیگر شعراء کے ہمراہ شاہ لطیف کے منتخب کلام کا بھی جرمن، چینی، فرنچ، روسی اور جاپانی زبانوں میں سرکاری طور پر ترجمہ کرایا ہے، جس کی وجہ سے شاہ، مذکورہ ممالک کے اہل دانش کے لیے باعث کشش بنا ہے۔ تاہم شاہ جو رسالو کا جو نسخہ سندھی کلچر ڈیپارٹمنٹ نے ممتاز مرزا

(مرحوم) کی کوششوں سے شایع کیا ہے، وہ انتہائی خوبصورت اور شاندار ہے۔ اس نے، نادر اور معیاری نسخوں مین بہترین اضافہ کیا ہے۔

البتہ جہاں تک شاہ صاحب کے سلسلہ ہائے طریقت کا تعلق ہے تو شاہ صاحب کے کلام کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ، عقیدے اور مسلک کے لحاظ سے خود پیر طریقت اور پرستار حق تھے' ان کے قریب، قربت رب جلیل ہی سب سے مقدم تھی۔

محققین میں سے مولانا دین محمد وفائی اور مرزا قلیج بیگ نے شاہ صاحب کو "قادریہ مسلک پر کاربند" بتایا ہے (٦٢) لیکن بعض علماء نے اس بات سے اس لیے انکار کیا ہے کہ "شاہ صاحب موسیقی کے دلدادہ تھے جس کی قادریہ مسلک میں ممانعت ہے جبکہ موسیقی کو چشتیہ سلسلے کا اہم جز گردانا جاتا ہے۔ (٦٣)

ایک اور محقق آڈوانی، آپ کو اس لیے "اویسیہ" سلسلے سے وابستہ بتاتے ہیں کہ آپ کے پردادا شاہ کریم ہالا کے اویسیہ بزرگ مخدوم نوح کے مرید تھے۔ جب شاہ لطیف پر شاہ کریم کی شاعری کا گہرا اثر موجود ہے تو لامحالہ مسلک کے اعتبار سے بھی آپ کی طبیعت پر اپنے پردادا کا اثر ہوا ہوگا۔ (٦٤)

تاہم اس ضمن میں خود شاہ جو رسالو پر غور و فکر کرنے سے یقین ہوجاتا ہے کہ شاہ صاحب نے رسمی طور پر کسی مسلک کو قبول ہی نہیں کیا۔ آپ نے خود باطنی بصیرت، وجدانی کیفیت اور عملی جدوجہد کے ذریعے ایک ایسے ہمہ گیر انسانیت کے مسلک کی بنیاد رکھی، جس میں فرقہ واریت اور تنگ نظری، تعصب اور نفرت کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

البتہ آپ کے اندر وطن کے لیے جو جذبات تھے وہ وہی تھے جو حضور اکرم ﷺ کے تھے، جس کے تحت آپ نے فرمایا تھا کہ حب وطن ایمان کا جز ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی

کہ شاہ صاحب نے ایک پورا سرمائی، حبِ وطن کی نذر کیا اور ایک بیت میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے التجا کی کہ "اے میرے محبوب! میرے وطن سندھ کو خوشحال بنا اور اس کے طفیل تمام عالم کو آباد رکھ۔"

وطن کی خوشحالی کے لیے عملی جدوجہد آپ کے ایک گہرے دوست شاہ عنایت شہید (جھوک والے) نے اس وقت شروع کی تھی جب دنیا میں طبقات کے خلاف جدوجہد کا تصور ہی موجود نہیں تھا۔ شاہ عنایت نے جس وقت یہ نعرہ دیا کہ "جو کمائے سو کھائے" تو شاہ صاحب بھی ان کی حمایت میں تھے۔ ان دونوں نے لوگوں کو مل جل کر کام کرنے، بنجر زمین آباد کرنے اور غربت مٹانے کی ترغیب دی۔

چنانچہ جھوک (سندھ) میں غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور پیشہ وروں کی بہت بڑی بستی آباد ہوگئی۔ یہ لوگ وہاں کی بنجر زمین کو آباد کرنے میں مصروف ہوگئے۔ اپنی مدد آپ کے تحت کئی کنویں کھود کر وہاں 'رلے لگائے گئے جن سے پانی نکال کر زمینیں سیراب کی جانے لگیں۔ ان کوششوں کے طفیل خوشحالی شروع ہونے کے آثار نمایاں ہوئے اور لوگوں میں شعور آیا۔

محنت کش طبقے کو باشعور دیکھنے کی ہمت صاحب اقتدار میں اس وقت بھی نہیں تھی۔ اس طبقے میں اتحاد و اتفاق کی برکت کا احساس پیدا ہونا کسی گناہ یا جرم سے کم بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ انھیں اس جرم کی سزا دینے کے لیے "قانون" حرکت میں آیا، سازش تیار ہوئی۔ چونکہ سندھ کے جس خطے کو خوشحال بنایا جارہا تھا اس کی حدود ایک طرف سے مغل گورنر کے ماتحت علاقے سے ملتی تھیں، تو دوسری طرف کلہوڑا حکمرانوں کی حاکمیت کا علاقہ لگتا تھا، اس لیے دونوں اطراف نے منظم طریقے سے فوج کشی کی اور علاقے کو

گھیرے میں لے لیا۔

تیسری طرف شاہ عنایت کی کوششوں سے پیروں کو مریدوں کی طرف سے نذر نیاز ملنی بند ہوگئی تھی اور لوگوں میں جاگیرداروں، نوابوں اور رئیسوں کی بیگار پر جانے سے انکار کرنے کی جرأت پیدا ہوگئی تھی، لہٰذا انھیں سب سے زیادہ مالی نقصان ہونے کے علاوہ ان کی اعلیٰ حیثیت میں بھی فرق آرہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بھی شاہ عنایت جیسے "گناہگار" کے خاتمے کی جنگ میں شریک ہونے کو اہمیت دی۔

اتحادیوں نے پہلا حکم یہ صادر کیا کہ کوئی شخص جھوک کی نگری میں "اللہ اکبر" نہیں کہے گا۔ وجہ یہ تھی کہ یہی یہاں کے کمینوں کا نعرہ تھا اور ایک دوسرے کی پہچان تھی۔

بہر حال میاں یار محمد کلہوڑو، شاہ عنایت کے پاس مصالحت کرانے کا پیغام لے کر آیا اور داڑھی پر ہاتھ پھیر کر قسم کھائی کہ شاہ عنایت ٹھٹھہ میں مغل گورنر کے دربار میں حاضر ہوجائے، بدلے میں نہ صرف شاہ عنایت کی جان بخشی کرائی جائے گی، بلکہ ان کی غریب پروری اور عوام کے درمیان اخوت و محبت میں اضافے کی تحریک بھی جاری رکھی جائے گی۔

لیکن ہوا یہ کہ مغل گورنر ٹھٹھہ نے شاہ عنایت کو شہید کرنے کی تیاری کرلی۔ جب شاہ عنایت نے دیکھا تو شعر کہا جس کا ترجمہ کچھ یوں بنتا ہے: میاں یار محمد نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر مردانہ وعدہ کیا، لیکن ان کی داڑھی نہیں بلکہ کتے کی دم ثابت ہوئی۔ (۶۵) غرضیکہ وعدہ خلافی ہوئی اور شاہ عنایت کو سن ۱۷۱۸ء میں شہید کیا گیا۔ آپ کے فقیروں کا جھوک میں اس قدر قتل عام ہوا اور ان کا اتنا خون ناحق بہایا گیا کہ انھیں انفرادی قبور

میں دفن کرنے کی بجائے اجتماعی قبروں میں دفنانے کا بندوبست بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ وہ کنویں جو کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ انھیں سے قبروں کا کام لیا گیا۔ آج بھی جھوک میں ایسے دو سو کنویں موجود ہیں جنھیں "شہیدوں کی قبریں" کہا جاتا ہے۔

یہ ایک تاریخی سانحہ تھا جس نے سندھ کے تمام اہل دل کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس المیے کو تاریخ کے اوراق پر بھی کندہ کر لیا گیا ہے اور ادب کی، جو بھی صنف، اس واقعے کے بعد تخلیق ہوئی، اس میں ظلم کی مذکورہ داستان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

خواجہ محمد زمان بن حاجی شیخ عبداللطیف (پ - ۱۷۱۳ء) بھی اسی زمانے کے تھے۔ آپ تیرھویں پشت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ سے جا ملتے تھے۔ مسلک کے اعتبار سے نقشبندی تھے۔ ۱۷۷۴ء میں آپ نے رحلت فرمائی۔

آپ، ٹھٹھہ کے ایک اہل اللہ خواجہ محمد ابوالمساکین کے مرید تھے۔ (۶۶) کم عمری میں ہی ریاضت و عبادت میں اتنے آگے نکل گئے کہ شاہ عبداللطیف اور شہید شاہ عنایت دونوں آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے گئے تھے۔ آپ کے متعلق شاہ لطیف نے فرمایا کہ "میں نے وہ لوگ دیکھے ہیں جنھوں نے محبوب کو دیکھا ہے۔ وہ اتنے عظیم ہیں کہ ان کی بات بیان سے باہر ہے۔"

خواجہ محمد زمان، صاحب ولایت ہونے کے علاوہ بہت بڑے عالم اور سندھی کے ممتاز شاعر بھی تھے۔ شاعری میں آپ کے ابیات بہت زیادہ ہیں، جن کی عربی میں شرح آپ کے مرید و اہل اللہ عبدالرحیم گرھوڑی نے کی ہے۔ آپ کے ایک بیت کا ترجمہ نمونتہً پیش کیا جاتا ہے۔

"شریعت نام ہے عمل کا، طریقت ہے محبت اور حقیقت نام ہے دل کا، معرفت نام ہے محبوب کی پہچان کا۔" سالک کو اپنے کلام میں آپ نے بھی، شاہ عبداللطیفؒ کی طرح جابجا تاکید کی ہے کہ "ہستی (خودی) ترک کردے اور یہی عمل ہے جس پر چل کر محبوب کی قربت حاصل کرپاؤ گے۔"

اس دور میں ان ہی موضوعات اور شعری اصناف کے تحت لسبیلہ (بلوچستان) کے بعض سندھی شعراء نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ایسے شعراء میں شیخ ابراہیم (ولادت - ۱۷۳۰ء) کا مقام سب سے بلند ہے۔ انھوں نے بیت، کافی، دوھڑہ اور "مدح" کی شاعری میں بڑا نام پیدا کیا۔ سندھ کے کئی مشہور قصے بھی انھوں نے منظوم کیے ہیں۔

سید کبیر شاہ مذکورہ بالا شاعر کے ہم عصر تھے اور ان کا تعلق بھی بلوچستان کے علاقے "اتھل" سے تھا۔ ان کی سندھی شاعری کی زبان انتہائی آسان اور ٹھیٹھ ہونے کی وجہ سے خاصی پسند کی گئی ہے۔ انھوں نے بھی سندھ کی مقبول شعری اصناف مثلاً بیت، کافی، دوہڑہ اور مدح کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ (٦٧)

"مدح" سندھی ادب کی خالص اپنی شعری صنف ہے۔ دراصل مدح عربی لفظ ہے اور اس کا "مطلب" تعریف ہے۔ بعض محققین کے خیال میں "مدح" کا بنیادی تصور "قصیدہ بردہ" سے لیا گیا ہے۔ یہ صنف جب سے سندھی شاعری میں در آئی ہے، تب سے حضور اکرم ﷺ سے اظہار عقیدت کے لیے اسے مناسب و موزوں سمجھا گیا ہے تاہم بعد میں اہل اللہ اور ولی اللہ جیسی متبرک ہستیوں سے احترام اور عقیدت کا اظہار کا موضوع مدح میں شامل کیا گیا۔

ایسے ہی موضوعات کو سمونے کے لیے سندھی میں ایک اور شعری صنف

"مناجات" بھی مروج ہے۔ مناجات میں طالب اپنے مطلوب (رب تعالیٰ) سے انتہائی عجز و انکساری کے انداز میں اپنے دکھوں اور مشکلات کا منظوم طریقے پر اظہار کرتا ہے اور ان سے نجات کے لیے التجائیں بیان کرتا ہے۔

کلہوڑا حکمران میاں سرفراز کی ایک ایسی ہی مناجات "بھلا جام ھن غلام سندو سوال سن توں" نہ صرف اس وقت مقبول و مشہور ہوئی تھی بلکہ آج بھی مذہبی لگاؤ رکھنے والی شاعری کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔

روحل فقیر کا پورا نام روح اللہ تھا اور قوم "زنگیجہ" تھی۔ غلام شاہ کلہوڑو کے ملازم ہونے کے بعد، موجودہ پنجاب کے گاؤں "لونگریہ" کو چھوڑ کر ضلع تھرپارکر میں آکر سکونت اختیار کی۔ طبیعتاً بڑے حساس تھے اور غور و فکر کی طرف زیادہ مائل تھے۔ کسی معمولی واقعے نے آپ کی طبیعت کو بے چین کردیا اور گاؤں چھوڑ کر جھوک میران پور میں ایک صاحب ولایت کے پاس آکر ٹھہر گئے۔ ریاضت و مجاہدے میں جب کمال حاصل کرلیا تو اپنے مرشد کے کہنے پر اٹھ کر چل پڑے اور ایک جگہ پر کسی جھاڑی میں آپ کا دامن اٹک گیا تو اسے منشاء ربانی سمجھ کر وہیں ڈیرہ ڈال دیا۔ جھاڑی کو سندھی میں "کنڈڑی" کہا جاتا ہے اس لیے اس مقام کا نام ہی کنڈڑی پڑگیا۔ کنڈڑی اب تحصیل روہڑی ضلع سکھر میں نہ صرف ایک مشہور مقام ہے بلکہ بڑی زیارت گاہ بھی ہے۔

روحل فقیر بڑے عالم و فاضل تھے۔ عربی، فارسی، سرائیکی، سندھی اور ہندی زبانوں پر آپ کو بڑا عبور حاصل تھا۔ ہندی شاعری میں آپ کا تخلص پیراگی تھا اور اس زبان کی شاعری میں اب تک آپ کا کوئی ثانی سامنے نہیں آیا۔ (۶۸) تاہم نقادوں کی نظر میں آپ، قدیم اردو شعراء مثلاً ملک جائسی اور خواجہ فرید گنج شکر کی صف میں کھڑے ہونے

کے اہل ہیں۔ ہندی میں آپ کی کئی تصانیف منظوم شکل میں ملتی ہیں جن میں سے "من سپربودھ"، "پریم گیان" اور "انبھو" بڑی مشہور ہوئیں۔ آپ کے مزاج کے مطابق ان تصانیف کا موضوع تصوف میں وحدت الوجود ہے، جس کی ساری عمر آپ نہ صرف ترجمان اور مبلغ بلکہ شارح بھی رہے۔ آپ نے بیت، غزل، کافی اور سہ حرفی کی اصناف میں اظہار کیا ہے۔ آپ کے خیالات کا اندازہ درج ذیل میں ایک دو اصناف کے ترجمے سے لگایا جاسکتا ہے۔

۱۔اگر پیپل میں پرمیشور ہے تو کیکر میں کون ہوگا

۲۔جن کا دل عشق سے سرشار ہے انھیں نہ بھوک کی فکر ہے اور نہ پیاس ہی انھیں ستائے گی۔ وہ تو ہر وقت وصال یار میں مگن رہتے ہیں۔ جو لوگ قلبی اور روحانی طور پر مطمئن ہیں ان سے دکھ بھی دور بھاگتے ہیں۔

صاحب ڈنہ فاروقی کو محمد حافظ بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کی ولادت ۱۶۹۷ء اور ۱۷۸۸ء آپ کا سال رحلت تھا۔ آپ بچل سرمت کے دادا تھے اور شاہ عبداللطیف کے ہم عصر اور دوست تھے۔ تصوف میں آپ کو وحدت الوجودی مسلک بہت پسند تھا اور آپ اس کے مبلغ، ترجمان اور شارح تھے۔ شاعری میں آپ کو اعلیٰ مقام حاصل تھا اور خاص طور پر بیت کی صنف آپ کو زیادہ پسند تھی۔ جس طرح کی شاعری کرتے تھے اور شاعری میں جو تصور و تخیل پیش کرتے ہیں اس کا اندازہ ایک شعر کے ترجمے سے لگایا جاسکے گا، جو درج ذیل دیا جاتا ہے۔

ترجمہ: "کچھ لوگ عشق میں داخل ہوتے ہی مدہوش ہوگئے اور بعض کو عشق نے پاگل کردیا ہے۔ لیکن صاحب ڈنہ نے اس عشق کی کتاب کے تمام اوراق الٹا کر دیکھے لیے

ہیں۔"

سید محمد بقاء بھی بلند پایہ شاعر اور مشہور عالم تھے۔ آپ راشدیہ خاندان کے مورث اعلیٰ تھے اور بیسویں پشت میں سید علی مکی سے جا ملتے ہیں۔ آپ ۱۷۲۲ء میں تولد ہوئے اور ۱۷۸۳ء میں شہادت نصیب ہوئی۔ آپ کو بھی عشق کا موضوع زیادہ پسند تھا۔ آپ کی شاعری کا مزاج آپ کے بیت کے درج ذیل ترجمہ سے معلوم ہوجائے گا۔

"سورج غروب ہوا اور پکھیرو واپس بسیروں میں آگئے۔ اگر ملاقات یار نہیں ہوئی تو اے دل مایوس مت ہو۔ صبح نئے سورج نکلتے ہیں بھورا بن کر پرواز شروع کر۔ اب کے محبوب سے تیرا وصال ضرور ہوجائے گا۔"

مخدوم عبدالرحیم گرھوڑی کا بھی یہی زیر تذکرہ زمانہ ہے۔ آپ نہ صرف صاحب ولایت تھے، بلکہ بہت بڑے عالم اور شاعر بھی تھے۔ اصناف میں الف اشباع کی شاعری کے علاوہ کبت (طویل نظم) اور ابیات آپ کو زیادہ پسند تھے۔ ایک بیت کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے

"محبوب کے حضور آہ و زاری کر۔ دردمندوں کی مدد کر، اپنی ہستی فنا کر اور محبوب کا مشاہدہ کرنے کے لیے کوشش کرتا رہ۔ ہر آدمی کو عزیز سمجھ اور کمزوروں کی مدد۔ دعوت حق پر ہنس راج کی چال چلا کر۔ عشق کا تیر آتا دیکھ کر منہ موڑنے کی بجائے سر کو سامنے رکھ۔ عشق کی تپش سے گھبرا مت، اس کا سامنا کر اور کود جا۔ اس سے آسانی ملے گی۔"

عنایت فقیر کا تعلق "ڈیرو" قوم سے تھا اور رشتے میں شاہ لطیف کے عزیز لگتے تھے۔ آپ بڑے شاعر بھی تھے لیکن آپ کی شاعری کی ہنوز تلاش جاری ہے جو کہ دیگر شعراء کے کلام میں شامل ہوگئی ہے۔ جو بہت تھوڑی، شاعری دستیاب ہوئی اس میں

تصوف اور عشق کے موضوعات واضح ملتے ہیں۔

مدن بھگت نہ صرف شاہ لطیف کے ہم عصر اور بے باک دوستوں میں شامل تھے، بلکہ سندھی میں شاعر بھی اعلیٰ پایہ کے تھے۔ آپ کی شاعری میں ہندو ویدانیت کی بجائے وحدانیت زیادہ ہے جس کا اظہار انھوں نے بیت کی صورت میں کیا ہے۔

عارف کلہوڑو بھی اسی عہد کے اچھے اور مشہور و مقبول شعراء میں شامل تھے۔ آپ سندھ کے حکمران عبدالنبی کے فرزند تھے۔ آپ کو جس موضوع نے زیادہ شہرت دی وہ سندھ کی حب الوطنی کی بنیاد پر مقبول ہونے والی عمر مارئی کی داستان کے پس منظر کی حامل شاعری ہے۔ اس شاعری میں عارف مرحوم نے عمر کی قید میں مارئی کے بسر ہونے والے ایک ایک دن کے احساسات اور جذبات کی عکاسی کی ہے۔

زیر تذکرہ دور کی شاعری میں بیت کے علاوہ متفرقہ شعری اصناف اور عوامی احساسات اور کیفیات کے حامل موضوعات ہیں، جنھیں عوام نے معیار کی کسوٹی پر نہیں بلکہ اپنے جذبات کی عکاس ہونے کی وجہ سے زیادہ پسند کیا۔

کلہوڑا دور کو ادبی اعتبار سے "سنہری عہد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں نہ صرف سندھی ادب کو فروغ ملا، بلکہ فارسی کے بھی بلند قدوقامت کے شعراء اور علماء آسمان علم و ادب کے افق پر نمایاں ہوئے۔ ایسے شعراء نے نہ صرف فارسی انداز، موضوع اور مفاہیم کے منظوم کیا بلکہ اصناف بھی فارسی کی متعارف کرائیں جس کے نتیجے میں "بے انداز" مثنویاں تخلیق ہوئیں، لاتعداد قصائد وجود میں آئے اور بے شمار دیوان مکمل ہوئے۔

بچل سرمست بھی صاحب دیوان تھے اور آپ کی کئی مثنویاں، اس منزلت کے قابل ہیں جس پر ایران میں فارسی کے اعلیٰ منصب پر فائز شعراء مثلاً عطار وغیرہ براجمان

تھے۔ آپ کا پورا نام عبدالوہاب اور والد کا نام میاں صلاح الدین تھا۔

سچل سرمست کی ولادت سن ۱۷۳۹ء میں سندھ کے ضلع خیرپور (میرز) کے قصبے "درازہ" میں ہوئی۔ آپ کے والد آپ کو کم سنی میں یتیم کرگئے۔ آپ کے چچا اور مرشد و استاد خواجہ عبدالحق نے آپ کو پدرانہ شفقت دی اور ہمہ پہلو پرورش کی۔ آپ کے یہ چچا، سندھی کے علاوہ فارسی اور عربی کے ماہر اور تصوف، روحانی علوم اور علم معرفت میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ آپ کی نسبت حضرت عمر فاروقؓ سے تھی اس لیے آپ کو فاروقی کہا جاتا ہے۔

عبدالوہاب نے سن شعور کو پہنچنے کے بعد سچل سرمست کے نام سے عالمی شہرت حاصل کی ہے۔ آپ نے مروجہ سندھی، سرائیکی، اردو، پنجابی اور ہندی کے علاوہ فارسی اور عربی جیسی عالمی زبانوں میں بھی اسی روانی، سلاست، فصاحت اور بلاغت کے ساتھ شاعری کی ہے۔ سندھی اور سرائیکی میں آپ کا تخلص "سچل"، "سچے ڈنہ" اور "سچو" ہے، جبکہ فارسی میں آپ "خدائی" اور "آشکارا" کے تخلص سے شاعری کرتے رہے ہیں۔ آپ کثیر اللسان تھے، اس لیے آپ کو "ہفت زبان شاعر" بھی کہا جاتا ہے۔

آپ نے ہر جا تصوف کے وحدت الوجودی یا ہمہ اوست کے فکر کو محور بنایا اور ہر زبان کو اپنے سماجی پس منظر کے مطابق استعاروں، اصطلاحوں، محاوروں اور تشبیہات سے مزین کیا ہے۔

آپ کو بے حال، محو، مجذوب یا مدہوشی کے اعتبار سے "سرمست" نہیں کہا جاتا بلکہ شاعری میں مصلحتوں سے پاک، صاف گوئی، سچائی، جرأت اور بے باکی سے اظہار خیال کرنے کی وجہ سے "سچل" اور "سرمست" کہا گیا ہے۔ آپ نے کم سنی میں قرآن کریم حفظ

کیا، عربی اور فارسی پر عبور حاصل کیا اور دینی علوم پر دسترس حاصل کی۔ سندھ میں آپ کی ولادت کے زمانے سے صدیاں پہلے ہی جاگیرداری نظام جڑیں پکڑ کر پختہ ہوچکا تھا، جہاں محنت کشوں، مزدوروں اور کسانوں کی حیثیت کیڑے مکوڑوں کی رہ گئی تھی۔ رہی سہی کسر وقت کے ان علماء، پیروں، فقیروں اور ملاؤں نے پوری کردی تھی جنھوں نے ان مقدس پیشوں کے نقاب اوڑھ لیے تھے جو معاشرے میں دین و دنیا میں سرخروئی کے حصول میں باشندگان خدا کی خدمت کرنے میں مصروف تھے۔ اصل یا نقلی دونوں کی سرگرمیاں ایک جیسی نظر آتی تھیں۔ ایسے ہی انسانیت دوست خدمت گزاروں کا ایک طبقہ تو حقیقی طور پر انسانیت کی خدمت کرکے اسے مشکلات اور ظلمتوں سے نجات دلانا چاہتا تھا، جبکہ دوسرا مفاد پرستوں کا گروہ سطحی علوم کا سہارا لے کر لوگوں کو ضعیف الاعتقادی میں مبتلا کرکے نذر و نیاز وصول کرتا تھا۔ جو لوگ ان کے دام میں آسانی سے نہ آتے، انھیں مذہب کے نام پر سزائیں دلائی جاتیں یا ظالم، جابر اور اذیت پسند صاحب اختیار اور بااثر طبقے کے مدد سے اذیتیں دلاکر اپنی دھاک بٹھائی جاتی اور اعلیٰ حیثیت کے حامل اشخاص کی خوشنودی بھی حاصل کرلی جاتی۔

کمزور حکمرانوں اور جاگیرداروں کی مدد کے طالب امیر ہر وقت ایسے لالچی اور حرص و ہوس کے پجاری ملاؤں اور سستے داموں علم فروخت کرنے والے، مذہب کا چوغہ پہنے پھرنے والے نقلی پیشواؤں کی تاک اور تلاش میں رہتے۔

ان حالات نے سندھی معاشرے کو غربت، مفلسی، ناداری، مجبوری، ڈر، خوف اور ظلم و ستم کے علاوہ ضعیف الاعتقادی میں مبتلا کر رکھا تھا، جس وقت کچل سرمست نے سن شعور کو چھوا۔

آپ نے عوام کو مایوسی اور غلاموں جیسی زندگی بسر کرتے دیکھا۔ نام نہاد مذہبی پیشواؤں کی ایک دوسرے پر الزام تراشیوں اور فتویٰ در جواب فتویٰ صادر کرنے کا مشاہدہ کیا اور بعض بڑے اثر و رسوخ رکھنے والے ملاؤں کو دین کو ذاتی مفادات کے عوض استعمال کرتے سنا اور تصدیق کی۔

ایسے ماحول نے ملک میں مایوسی، تفرقے بازی، طبقات، سیاسی گھٹن اور تنگ نظری کی فضا کو فروغ دے رکھا تھا۔ لیکن سچل سرمست تو تھے ہی نڈر، مصلحتوں سے پاک اور بے باک بات کہنے والے۔ یہی باتیں آپ کی شاعری میں بھی نمایاں ملتی ہیں۔ آپ کا کلام پختہ یقین کا حامل اور محبتوں کا امین ہونے کی وجہ سے نسل در نسل دائمی طور پر ذہنوں کی آبیاری کرنے والا ہے۔ آپ نے جہاں بھی اور جس سماجی شعبے کو بھی کمزور دیکھا نہ صرف اس کی نشاندہی شاعری میں کی، بلکہ شاعری ہی کو اصلاحی امور بیان کرنے کا ذریعہ بھی بنایا۔

آپ نے سندھی اور سرائیکی کی مقبول اصناف مثلاً کافی، بیت اور دوھڑہ کی اصناف کو برملا اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔

آپ کی سرائیکی کافی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے :

دوزخ بہشت دے ڈے نہ دڑ کے،

اتھے بھؤ اسان کنوں بھگے بھگے۔

باب برہ دا کوئی نہ پڑھدائیں

کاغذ رکھدائیں بگے بگے۔

ملاں دی دوڑ میستی تائیں،

عشق دی منزل اگے اگے۔

پچو ہے سکین نمانا،

توہ تینڈے نال لگے لگے۔ (۶۹)

ترجمہ: دوزخ کا خوف اور بہشت کا لالچ نہ دے ہمیں، خوف اور ڈر بھی ہم سے ڈر کر بھاگ چلے ہیں۔

اے قلکار لکھنے سے پیشتر عشق کا باب پڑھ، خوامخواہ صاف ستھرے کاغذ کالے نہ کیا کر، ملاں بھی اپنے علم کو مسجد تک محدود رکھتا ہے، اسے عشق کی منزل تو معلوم ہی نہیں۔ اے میرے مالک آپ تو جانتے ہیں کہ پچو آپ کا نیازمند ہے اور تیرے ہی آسرے اور کرم سے اس کا وجود ہے۔

تقابلی جائزہ پیش کرنے والے محققین نے سچل کا ترکی اور بعض ممتاز ایرانی شعراء سے تقابل کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "آپ کی شاندار شاعری کو مذکورہ ممالک کے ان بلند مقام پانے والے شعراء کے بے مثل کلام سے ہمرکاب کیا جانا چاہئے جو آپ سے پہلے ہو کر گزرے ہیں۔" (۷۰)

غالباً اسی وجہ سے ماضی میں سچل کو اسلامی دنیا کے برگزیدہ اور اہم صوفی شعراء کے مدمقابل لاکھڑا کیا گیا تھا...... اس شاعر کی عظمت یہ ہی کہ آپ کی شاعری نامساعد حالات یا پرمسرت مواقع، دکھ کی کیفیات یا مصائب اور مشکلات کے گھیرے میں انسانی اتحاد و اتفاق کا درس دیتی ملتی ہے۔ (۷۱) اسی کارن محققین نے آپ کو "سندھ کا عطار" بھی کہا ہے۔ نقادوں کا خیال ہے کہ بغداد کے شہید صوفی منصور حلاج جو ۹۰۵ء میں سندھ آئے تھے اور جس نے تمام برصغیر کے اکثر اہل تصوف کو بہت متاثر کیا تھا، اس میں ایران اور برصغیر کے صوفیوں کو سچے عاشق کی اور مقصد کی خاطر کسی قربانی دینے والے شخص کی

خوبیاں نظر آئی تھیں۔ لفظ "سچل" میں بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ، منصور حلاج کے نعرے "انا الحق" کی تمثیل تھی۔ (۷۲)

منصور حلاج (جسے بغداد میں ۹۲۲ء میں سولی پر چڑھایا گیا تھا)، کا سندھ کی لوک شاعری میں بھی بہت تذکرہ کیا جاتا رہا ہے اور اسے سندھ کا ہر شخص جہاں کہیں بھی ہو اچھی طرح جانتا ہے۔ سچل کو بھی منصور حلاج کے پیغام کا حقیقی مبلغ گردانا جاتا ہے۔

ایک تو منصور حلاج کے نظریات کی وجہ سے اور دوسرا یہ کہ سچل کو محض آدمیت اور انسان ذات سے محبت سکھانے والے اور اللہ کے سچے عاشق کی حیثیت رکھنے کے باعث سندھ میں بغیر کسی مذہبی اونچ نیچ کے بہت عزت و احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ سچل کے ایک مرتب نے غالباً اسی وجہ سے لکھا ہے کہ "سندھی ماحول نے اہل تصوف کا اس قدر اثر قبول کیا ہے کہ، موجودہ دور کی مشرقی دنیا میں جہاں بھی تصوف کے اثرات ہیں وہاں کے کسی بھی ملک کے لوگوں کا سندھ سے تقابل ہو ہی نہیں سکتا۔ (۷۳)

سچل، انسانی حقیقت جاننے کے لیے بھی کوشاں رہتے تھے۔ ایک سندھی کافی میں اس لیے آپ نے، خود سے کئی سوال در سوال پوچھے ہیں اور خود ہی جوابات دیے ہیں۔ ان جوابات پر غور کرنے سے انسانی وجود کے کئی رنگین پہلو سامنے آتے ہیں۔ "سکھیو میں خود کو سمجھ نہیں پایا ہوں میں کون ہوں؟ کبھی خود کو ایسی گڑیا اور پتلی سمجھتا ہوں جس کی دوڑ کسی اور کے ہاتھ میں ہو، بعض اوقات خود کو ایسا وسیع و عریض اور عالیشان محل سمجھتا ہوں جس میں شہنشاہ کا دربار لگایا گیا، کئی فریادی اور مظلوم آکر وہاں داستان غم سناتے اور عدل و انصاف کا تقاضا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی خود کو سرپٹ بھاگنے والا گھوڑا سمجھتا ہوں جس کی لگام شہسوار کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

سکھیو! بتاؤ میں کون ہوں؟ کیا موج دریا ہوں جس میں بے رحمی ہوتی ہے یا لالائی سے بھرپور مہندی کا پھول ہوں، مہک سے فضا کو مہکانے والا پھول ہوں، پہاڑ کی کوکھ سے پھوٹنے والا چشمہ ہوں یا مہتاب اور آفتاب کا سایہ ہوں یا سایہ ہوں اس حق کا، جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا؟ (۷۴)

بچل نے اردو میں غزل کے علاوہ بھی کافی کی صنف متعارف کرائی ہے۔ جس کا نمونہ یہ ہے:

جس دیس سے آئے ہو کاگا! بتا کچھ بات بھی
پریتم نے پوچھے تھے بھلا، تجھ سے میرے حالات بھی؟
کاگا تسلی دے مجھے کیا وہ یہاں آنے کو تھے؟
کیا مجھ سی دکھیارن کے گھر میں وہ رہیں گے رات بھی؟
کاگا! بتا! دیکھی کبھی مجھ جیسی دکھیاری؟
پریتم نے کچھ بھیجی بتا، پیغام سی سوغات بھی؟
دائم رہیں ہم وصل میں، وہ وقت بھی لائے خدا،
بچو یہ ہوگا جب کرم، تھم جائے گی برسات بھی (۷۵)

آپ نے فارسی میں، اپنے تخلص کی نسبت سے اپنے دونوں دیوانوں کے نام رکھے ہیں۔ جو فارسی خواندہ لوگوں کے لیے باعث کشش ہیں۔ "دیوان آشکار" اور "دیوان خدائی" کے علاوہ فارسی میں آپ کی دس مثنویاں بھی ہیں، جنھیں مرحوم قاضی علی اکبر درازی نے اردو ترجمے کے ساتھ شایع کرلیا تھا۔

زبان چاہے کوئی بھی ہو لیکن آپ کا سارا کلام رندانہ ہے جو بے باکی، جذب اور

سرمستی کا مجسمہ ہے۔ کافی کی صنف اگرچہ آپؒ سے پہلے بھی سندھ اور پنجاب کے علاوہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں رائج رہی لیکن سچل کی کافی بڑی وسعت اور گہرائی کی حامل ہے۔ آپ نے کافی کے بیسیوں نمونے پیش کیے ہیں اور سب کی سب منصوری مسلک کے حامل ہیں۔ یہی انداز بیان اور منصوری نعرہ آپ کی مثنویوں میں بھی ملتا ہے۔

مثنوی کا ایرانی شاعری میں آغاز "رودکی" سے ہوتا ہے۔ بعد ازاں مولانا رومی کی مثنویوں کے علاوہ اسدی کا گشتاسپ نامہ، دقیقی کا شاہنامہ، نظامی کا سکندر نامہ اور ہاتفی کا تیمور نامہ وغیرہ بھی مثنوی میں موجود ہے۔

اس قسم کا فارسی ادب رفتہ رفتہ پہلے ایرانی علماء اور ادیبوں کے حوالے سے اور بعد میں خود سندھی علماء کے طفیل مدارس کے نصاب کا حصہ بنا اور مقبولیت پائی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ان کے اندر رجز، رزم، عشق، پند و نصائح اور ناصحانہ مضامین بڑے دلچسپ پیرائے میں سموئے گئے تھے، جنہیں سندھی میں ترجمہ کر کے اہل سندھ سے متعارف کرلیا گیا۔ ان مثنویوں میں دیگر موضوع کے علاوہ تصوف کے اسرار و رموز بھی سموئے گئے تھے۔

اس ضمن میں مولانا دین محمد ادیب نے رومی کی مثنوی کا اشرف العلوم کے نام سے ترجمہ کیا۔ مولانا سعدالدین محمود شبستری (وفات ۱۳۲۰ء) کی مثنوی گلشن راز کو مرزا قلیچ بیگ (وفات ۱۹۲۰ء) نے کشف الحجاز کے نام سے، مولانا جامی (ولادت ۱۴۱۴ء، وفات ۱۴۹۲ء) کی مثنوی یوسف زلیخا کا سندھی ترجمہ میر غلام مرتضیٰ نے کیا۔

مذکورہ مثنویوں کے منظوم سندھی ترجمے ہوتے رہے، لیکن شاہ نامہ فردوس کا سندھی نثر میں محمد عاقل عاقلی نے ترجمہ کیا۔ بعض سندھی شعراء نے تو خود بھی سندھی اور فارسی زبانوں میں مثنویاں تخلیق کی ہیں تاہم سچل سرمست کی اس قسم کی شاعری بہت

ہی بلند مقام رکھتی ہے۔

قصیدہ: فارسی کے زیر اثر عروضی شعری اصناف جو سندھی میں شامل ہوئیں، قصیدہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ قصیدے کی بنیاد عربی شاعری میں چھٹی صدی عیسوی میں نظر آتی ہے۔ (۷۶) غالبًا اہل فارس نے بھی اسی سے اثر لیا اور قصیدے کو اہل ایران سے متعارف کرایا۔ اہل ایران اور سندھ کے مختلف قسم کے تعلقات اور فارسی کے ماہرین، شعراء، علماء اور اساتذہ سے اہل سندھ کے روابط کی وجہ سے قصیدہ سندھی ادب میں شامل ہوا۔

لفظ قصیدے کا "مادہ" "قصد" یعنی ارادہ ہے۔ چونکہ ابتدائی طور پر قصیدہ ارادی طور پر مدح سرائی، ہجو یا تعریف کے لیے استعمال ہوتا تھا جسے بعد میں، محض مدح سرائی، کے لیے مخصوص کیا گیا اس لیے اسے قصیدے کا نام دیا گیا۔ (۷۷)

عربی قصیدے میں امرؤالقیس کا نام سر فہرست رہا لیکن کعب بن زہیر ان شعراء میں شامل تھا جنھیں ۶۳۰ء میں حضور اکرم ﷺ کے حضور قصیدہ "بانت سعاد" پڑھنے کا موقع ملا جو اس نے، اپنی تیز رفتار، خوبصورت اور سبک رفتار اونٹنی سعاد کی شان میں منظوم کیا تھا۔ اسی طرح ابوبکر سعد زنگی جن کی شیخ سعدی نے بھی تعریف کی، نامور قصیدہ نویس شاعر گزرے ہیں۔ اس طرح فارسی دان شعراء کے پاس قصیدہ نویسی کی ایک ہزار سالہ پرانی تاریخ ہے۔ وہ اس صنف سخن میں پند و نصائح، عرفان، عدل، عشق، سلوک اور بے باکی کا بھرپور ذکر کرتے تھے اور اس میں علمی اصطلاحیں اور تلمیحات بھی اعلیٰ پایہ کی استعمال کرتے تھے۔ اس ضمن میں خاقانی (وفات ۱۱۷۵ء) کا نام لیا جاسکتا ہے۔

بعد ازاں یہ شعری صنف جب خوشامد، خوشنودی اور مبالغہ آرائی کے لیے استعمال

ہونا شروع ہوئی، تو اصل مقاصد پس پشت ڈال دیے گئے۔ اس عرصے کے دوران قصیدہ کو شعراء نے لالچ، خود غرضی اور مفاد پرستی کے کارناموں کے لیے مخصوص کر لیا اور انھوں نے "سمندر میں ہل چلادئے اور آسمان میں تیر پھینک کر ستاروں کا شکار کرنا شروع کیا۔" جس کے بدلے بعض شعراء کو امید سے زیادہ کامیابی ہوئی، انھیں خلعتیں ملیں، نقدی، جواہرات، جاگیریں اور دولت حاصل ہوئی۔

اس حوالے سے برصغیر میں محمد جان قدسی کا نام لیا جاسکتا ہے، جس نے شاہجہان بادشاہ کی شان میں جب قصیدہ لکھا، تو بادشاہ نے اس کا چاندی میں وزن کرا کر وہ چاندی اسے انعام کے طور پر دے دی۔ پھر جب اسی شاعر نے اس کی ملکہ جہاں آرا بیگم کی صحت یابی کا قصیدہ لکھا تو "سات مرتبہ اس کا منہ ہیرے جواہرات سے بھر دیا گیا۔" (۷۸)

چنانچہ اردو شاعری نے قصیدہ اور قصیدہ نویسی کا وہی انداز فارسی سے حاصل کیا لیکن اردو قصیدے نے وہ مقام حاصل نہیں کیا جو فارسی قصیدے کو ملا۔ (۷۹)

سندھی قصیدہ بھی فارسی قصیدے کو اپنا پیش رو گردان کر آگے بڑھا لیکن سماجی سطح پر نہ خوشامد پسندی ہوتی ہے اور نہ لالچ، حرص اور ہوس کی پذیرائی کی جاتی ہے۔ مزید برآں مبالغہ آرائی تو سندھی سماج کو کسی سطح پر بھی قبول نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اگرچہ فارسی کے زیر اثر غلام محمد شاہ "گدا"، میر عبدالحسین "ساجی" مرزا قلیچ بیگ، محمد ہاشم "مخلص" ہدایت علی "نجفی"، شمس الدین "بلبل"، لیکھراج "عزیز"، محمد ابراہیم "خلیل" اور دیگر اسی پایہ کے ممتاز شعراء جن کی دیگر اصناف پر مشتمل شاعری کی خوب پذیرائی نصیب ہوئی لیکن قصیدہ نویسی کو پسندیدگی نہ ملی جس کے باعث یہ صنف رفتہ رفتہ سندھی ادب سے مفقود ہوگئی۔ البتہ مرثیے کا مرتبہ بہت [redacted] نظر آتا ہے۔

مرثیہ : مرثیے کی بنیاد عربی کا لفظ "رثا" ہے، جس کے لغوی معنی فوت ہوجانے والے یا جدا ہوجانے والے کی خوبیاں بیان کرنا ہیں۔ اس شعری صنف کا آغاز عربی میں اور عربی کے ذریعے فارسی میں ہوا، بعد میں یہ فارسی سے سندھی ادب کا حصہ بنی۔ مرثیے کے موضوعات، جذبات کا مکمل اظہار ہیں۔ اس میں حزنیہ کیفیات کا بھرپور اظہار آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ فارسی میں مرثیہ "رودکی" (وفات ۹۵۲ء) سے ملتا ہے لیکن سندھی میں باقاعدہ صنف کا درجہ دلانے والے سید ثابت علی شاہ (پیدائش ۱۷۴۰ء، وفات ۱۸۱۰ء) تھے۔ مرزا بڈھل بیگ اور مرزا قلیچ بیگ نے بھی مرثیے کی صنف کو خوب فروغ دیا جبکہ اردو میں مرثیہ نویسی کو بطور شعری صنف ترقی دلانے والے میر انیس اور مرزا دبیر تھے جن کے سن ولادت ۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۳ء ہیں۔ جس طرح مذکورہ دونوں شعراء کی ادبی تاریخ میں وجہ شہرت مرثیہ تھی اسی طرح سندھی ادب میں سید ثابت علی شاہ نے مرثیے کی صنف کو بلند مقام دے کر تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

سید ثابت علی شاہ کو سندھی ادب میں اگرچہ ہجونگاری میں بھی ملکہ حاصل تھا، تاہم مرثیہ نویسی اور سید ثابت علی شاہ دونوں سندھی ادب میں اکٹھے نظر آتے ہیں۔ آپ کے مرثیے میں اثرانگیزی، درد، سوز، سلاست، سیرت نگاری، کردار نگاری، واقع نگاری اور حقائق نگاری کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ یہی بلند پایہ مرثیے کے اوصاف ہوتے ہیں۔ سندھی مرثیہ نویسی میں دوسری بلند قامد شخصیات میں سید اسداللہ شاہ حسینی بھی سرفہرست ہیں جو ثابت علی شاہ کے نہ صرف ہمعصر اور ہم خیال تھے، بلکہ دونوں آپس میں بہت اچھے دوست بھی تھے۔ (۸۰)

یہ دونوں مرثیہ گو شعراء مرثیے میں انتہائی آسان اور عام فہم سندھی استعمال کرنے کے قائل ہیں، لیکن [redacted] سندھی کے شمالی لہجے سرائیکی مرثیہ گو شعراء کا

بھی تھا۔ جہاں مرثیے کی تاریخ اس سے کافی پرانی ہے۔ حامد ملتانی کی تصنیف "جنگ نامہ" کے مطابق سن ۱۴۴۸ء میں سرائیکی میں مرثیہ نویسی کا رواج تھا۔ لیکن یہ بات محض چند حوالوں تک محدود ہے۔ تاہم مغلیہ دور کی تاریخ نے شاہجہان کے زمانے کے ایک بلند پایہ مرثیہ گو شاعر سکندر لاشاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سکندر لاشاری ۱۶۵۴ء میں حیات تھا جب اورنگزیب ملتان کے گورنر بنے تھے۔"

مطالعہ تاریخ کے دوران یہ بھی ثبوت ملتا ہے کہ "سال ۱۶۷۸ء میں سید شیرانی نے بھی ڈیروی انداز میں مرثیہ نویسی کی تھی جو ان کا مادری لہجہ تھا کیونکہ سید شیرانی، ڈیرہ اسماعیل خان کے باشندے تھے۔" فنی باتوں کی تفصیل بتاتے ہوئے تاریخ نے لکھا ہے کہ "ان مرثیوں کا رسم الخط پرانے نمونے کا ہے" اس حوالے کی تفصیل "پیر اصحابی" نے یہ بیان کی ہے کہ "اس وقت کے مرثیے میں تذکیر و تانیث کا خیال کم رکھا جاتا تھا۔ ہیئت کے اعتبار سے ہر بند کے بعد دوھڑہ دیا جاتا تھا اور اختتام سے پہلے لازم طور پر کسی معصوم کی شہادت کا ذکر کیا جاتا تھا" اس وقت کے مرثیے سے چند مصرعے نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں:

بندے، ملک، مرسل، بنی ہاشم، ماتم کرن سارے،
رووے طالب وہی شاہ داڈو ہیں ہتھ سرتے مارے،
حسن حسین تے، زینت، فریاداں کرن تارے.....الخ

سرائیکی مرثیے کے متعلق سب سے زیادہ مؤثر، معتبر اور مستند تحریری حوالہ سید خدا بخش کا ملا ہے جو خود بھی ذاکر تھا۔ سید صاحب کی ولادت ۱۷۶۱ء اور وفات ۱۸۱۷ء میں ہوئی۔ ان کی ایک بیاض بھی ملی ہے جس میں قدیم دور کے سرائیکی میں مرثیہ گوئی کرنے والے شعراء، "عاجز" اور "بردہ" کے مرثیے درج ہیں۔ ان مرثیوں کی زبان سے ہی

ان کی قدامت کا اظہار ہوتا ہے۔ نیز ان کا انداز بھی روائتی مرثیوں کے مقابلے میں کافی مختلف ہے۔ عام طور پر روائتی مرثیوں میں ہر بند چار مصرعوں کا ہوتا ہے، جبکہ ان مرثیوں کو سات اور آٹھ مصرعوں کی ٹکڑیوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۸۱)

یہی وہ زمانہ تھا جب ایرانی مبلغین و مدرسین کی تعلیم و تربیت کے زیر اثر یہاں کی شعری اصناف میں مروج اصناف شامل ہوئیں۔ یہاں جو شعری اصناف ازل سے مروج، مقبول اور مشہور تھیں ان کے پیمانے چھند کے اصولوں کے پابند تھے، جبکہ ایرانی شاعری کے نہ صرف پیمانے علم عروض کے تحت ہیں، بلکہ انداز بیان، ادائیگی، الفاظ کا استعمال، تراکیب، محاورے، استعارے، اصطلاحیں اور تشبیہات وغیرہ بھی پہلے سے مروجہ ترتیب کے مقابلے میں مختلف ہیں۔ اس بات کی گواہی ایک اور شعری صنف غزل کا وجود دیتا ہے۔

غزل: یہ صنف ان شعری اصناف میں شامل ہے جو ایران کے زیر اثر سندھی ادب کا حصہ بنی ہیں۔ اس کا نہ صرف بحر وزن عروضی ہے بلکہ فنی خوبیوں، خیال، تصور اور ہیئت سمیت اسے ہمارے شعراء نے مکمل طور پر قبول کیا اور اسے اس طرح قبول کیا ہے جس طرح یہاں کے باشندوں نے خود ایرانی علوم کو پسند کیا۔

غزل کو اگرچہ ابتدا میں ایران میں بھی عشقیہ موضوعات اور عشق کی مرحلہ وارداتوں اور درجہ بدرجہ رونما ہونے والی کیفیات و جذبات کا اظہار کرنے کے لیے موزوں و مناسب گردانا گیا تھا لیکن بعد ازاں جب یہ صنف فارسی کے مشہور شعراء مثلاً سنائی (وفات ۱۱۵۰ء) رومی (وفات ۱۲۷۳ء) حافظ شیرازی (وفات ۱۳۸۹ء) اور سعدی (وفات ۱۲۹۱ء) تک پہنچی تو اس میں ہدایات، پند و نصائح، اصلاحی نکات، خیر خواہی کے موضوعات، معرفت کے موتی اور تصوف کے راز و رموز کے علاوہ دین داری اور دنیا و آخرت کے متعلق مضامین و مفاہیم بھی سموئے جانے لگے۔

یہی روایت سندھی ادب میں منتقل ہوئی۔ چنانچہ سندھی غزل کو بالواسطہ فارسی غزل سے متاثرہ صورت میں سندھ کے سخن وروں نے اپنایا۔ آخوند گل محمد "گلچ" جو کہ عربی اور فارسی کے بھی نامور عالم و شاعر تھے، انھوں نے جب غزل کو سندھ کی سرزمین سے شناسا کیا، تو ان کے "دیوان گل" سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بھی معرفت، تصوف کی تعلیمات، فنا، بقاء، تعلیمات اور احادیث کے موضوعات کو غزل میں موضوع سخن بنایا۔

"دیوان قاسم" کے خالق آخوند محمد قاسم "قاسم" بذکورہ بالا صاحب دیوان شاعر کے ہمعصر تھے۔ آپ کا شمار سندھ کے ان غزل گو شعراء میں ہوتا ہے جو اوائلی دور کے ہیں اور جنھیں صاحب دیوان ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آپ کا دیوان قاسم اس وقت شائع ہوا جب کراچی سے ابتدائی دنوں میں لیتھو پریس نے اشاعت شروع کی تھی۔ آپ کی غزلوں کے چند منتخب اشعار مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

عشق وارن کھان اچی سکھ برھ جی بات
آھے ای نکتو عجائب انتخاب ..... الخ

انھوں نے دنیا میں محبت اور خلوص و وفا کی عدم موجودگی کا اظہار جس انداز میں کیا اس کا عام فہم اردو میں مفہوم اس طرح ہوتا ہے:

آج مروت و وفا آدمیوں میں ہے نایاب
صداقت بھی بالکل آدمیوں میں نہیں ملتی ..... الخ

ایرانی غزل کی پیروی کرتے ہوئے آگے جو کہا گیا اس کا مطلب اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

مندر میں مجھے میرا صنم نظر آتا ہے۔ (تاہم)
میرا مت جو اس کے پاس ہے وہ کرچیوں میں نظر آتا ہے۔ (جاری ہے)